تفہیم القرآن

الاحزاب

(۲)

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

اے[1] نبی اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو، حقیقت میں علیم اور حکیم تو اللہ ہی ہے[2]۔ پیروی کرو اُس بات کی جس کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں کیا جا رہا ہے،

[1] جیسا کہ ہم اس سورہ کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، یہ آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب حضرت زید حضرت زینب کو طلاق دے چکے تھے۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی یہ محسوس فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا اشارہ بھی یہی تھا کہ منہ بولے رشتوں کے معاملہ میں جاہلیت کے رسوم و اوہام پر ضرب لگانے کا یہ ٹھیک موقع ہے، اب آپ کو خود آگے بڑھ کر اپنے منہ بولے بیٹے (زید) کی مطلقہ سے نکاح کر لینا چاہیے تاکہ یہ رسم قطعی طور پر ٹوٹ جائے۔ لیکن جس وجہ سے حضور اس معاملہ میں قدم اٹھاتے ہوئے جھجک رہے تھے وہ یہ خوف تھا کہ اس سے کفار و منافقین کو، جو پہلے ہی آپ کی پے در پے کامیابیوں سے جلے بیٹھے تھے، آپ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے ایک زبردست ہتھیار مل جائے گا۔ یہ خوف کچھ اپنی بدنامی کے اندیشے سے نہ تھا، بلکہ اس بنا پر تھا کہ اس سے اسلام کو زک پہنچے گی، دشمنوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ جو اسلام کی طرف میلان رکھتے ہیں بدگمان ہو جائیں گے، بہت سے غیر جانبدار لوگ دشمنوں میں شامل ہو جائیں گے، اور خود مسلمانوں میں سے کمزور عقل و ذہن کے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں گے۔ اس لیے حضور یہ خیال کرتے تھے کہ جاہلیت کی ایک رسم کو توڑنے کی خاطر ایسا قدم اٹھانا خلافِ مصلحت ہے جس سے اسلام کے

اللہ ہر اُس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔[۳] اللہ پر توکل کرو، اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے۔[۴]

عظیم تر مقاصد کو نقصان پہنچ جائے۔

[۲] تقریر کا آغاز کرتے ہوئے پہلے ہی فقرے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے اِن اندیشوں کو رفع فرما دیا۔ ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ہمارے دین کی مصلحت کس چیز میں ہے اور کس میں نہیں ہے ـــــــ اس کو ہم زیادہ جانتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ کس وقت کیا کام کرنا چاہیے اور کونسا کام خلافِ مصلحت ہے۔ لہٰذا تم وہ طرزِ عمل اختیار نہ کرو جو کفار و منافقین کی مرضی کے مطابق ہو بلکہ وہ کام کرو جو ہماری مرضی کے مطابق ہو۔ ڈرنے کے لائق ہم ہیں نہ کہ کفار و منافقین۔

[۳] اس فقرے میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہے اور مسلمانوں سے بھی اور مخالفینِ اسلام سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ نبی اگر اللہ کے حکم پر عمل کر کے بدنامی کا خطرہ مول لیگا اور اپنی عزت پر دشمنوں کے حملے صبر کے ساتھ برداشت کریگا تو اللہ سے اس کی یہ وفادارانہ خدمت چھپی نہ رہے گی۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ نبی کی عقیدت میں ثابت قدم رہیں گے اور جو شکوک و شبہات میں مبتلا ہونگے، دونوں ہی کا حال اللہ سے مخفی نہ رہے گا۔ اور کفار و منافقین اس کو بدنام کرنے کے لیے جو دوڑ دھوپ کریں گے اس سے بھی اللہ بے خبر نہ رہے گا۔ لہٰذا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہر ایک اپنے عمل کے لحاظ سے جس جزا یا سزا کا مستحق ہوگا وہ اسے مل کر رہے گی۔

[۴] اس فقرے کے مخاطب پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضورؐ کو ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ جو فرض تم پر عائد کیا گیا ہے اسے اللہ کے بھروسے پر انجام دو اور دنیا بھر بھی اگر مخالف ہو تو اس کی پروا نہ کرو۔ جب آدمی کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو کہ فلاں حکم اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے تو پھر اسے بالکل مطمئن ہو جانا چاہیے کہ ساری خیر اور مصلحت اسی حکم کی تعمیل میں ہے۔ اس کے بعد حکمت و مصلحت دیکھنا اس شخص کا اپنا کام نہیں ہے، بلکہ اسے اللہ کے اعتماد پر صرف تعمیل ارشاد کرنی چاہیے۔ اللہ اس کے لیے بالکل کافی ہے کہ بندہ اپنے معاملات اُس کے سپر

اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے ہیں[۵]، نہ اس نے تم لوگوں کی اُن بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری ماں بنا دیا ہے[۶]، اور نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے[۷]۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے، اور وہی صحیح طریقے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ

کہ دے۔ وہ رہنمائی کے لیے بھی کافی ہے اور مدد کے لیے بھی، اور وہی اس امر کا ضامن بھی ہے کہ اُس کی رہنمائی میں کام کرنے والا آدمی کبھی نتائج بد سے دوچار نہ ہو۔

۵؎ یعنی ایک آدمی بیک وقت مومن اور منافق، سچا اور جھوٹا، بدکار اور نیکوکار نہیں ہو سکتا اس کے سینے میں دو دل نہیں ہیں کہ ایک دل میں اخلاص ہو اور دوسرے میں بدنیتی، ایک میں انکار ہو اور دوسرے میں اقرار، ایک میں خدا کا خوف ہو اور دوسرے میں خدا سے بے خوفی۔ لہٰذا ایک وقت میں آدمی کی ایک ہی حیثیت ہو سکتی ہے۔ یا تو وہ مومن ہوگا یا منافق۔ یا تو وہ کافر ہوگا یا مسلم اب اگر تم کسی مومن کو منافق کہہ دو یا منافق کو مومن تو اس سے حقیقتِ نفس الامری نہ بدل جائیگی اس شخص کی اصل حیثیت لازماً ایک ہی رہے گی۔

۶؎ "ظہار" عرب کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ قدیم زمانے میں عرب کے لوگ بیوی سے لڑتے ہوئے کبھی یہ کہہ بیٹھتے تھے کہ "تیری پیٹھ میرے لیے میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے" اور یہ بات جب کسی کے منہ سے نکل جاتی تھی تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اب یہ عورت اس پر حرام ہو گئی ہے کیونکہ وہ اسے ماں سے تشبیہ دے چکا ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیوی کو ماں کہنے یا ماں کے ساتھ تشبیہ دے دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی۔ ماں تو وہی ہے جس نے آدمی کو جنا ہے۔ محض زبان سے ماں کہہ دینا حقیقت کو نہیں بدل دیتا کہ جو بیوی تھی وہ اب تمہارے کہنے سے ماں بن جائے۔ (یہاں ظہار کے متعلق شریعت کا قانون بیان کرنا مقصود نہیں ہے اس کا قانون سورۂ مجادلہ، آیات ۲-۴ میں بیان کیا گیا ہے)۔

کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔ اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں۔ نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے، لیکن اُس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔

---

۷ یہ اصل مقصود کلام ہے۔ اوپر کے دونوں فقرے اسی تیسری بات کو ذہن نشین کرنے کے لیے بطور دلیل ارشاد ہوئے تھے۔

۸ اِس حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے جو اصلاح نافذ کی گئی وہ یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے حضرت زید کو زید بن محمدؐ کہنے کے بجائے ان کے حقیقی باپ کی نسبت سے زید بن حارثہ کہنا شروع کر دیا گیا۔ بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زید بن حارثہ کو پہلے سب لوگ زید بن محمدؐ کہتے تھے۔ یہ آیت نازل ہونے کے بعد انہیں زید بن حارثہ کہنے لگے۔ مزید برآں اِس آیت کے نزول کے بعد یہ بات حرام قرار دے دی گئی کہ کوئی شخص اپنے حقیقی باپ کے سوا کسی اور کی طرف اپنا نسب منسوب کرے۔ بخاری و مسلم اور ابوداؤد نے حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من ادعیٰ الیٰ غیر ابیہ وھو یعلم انہ غیر ابیہ فالجنۃ علیہ حرام۔ "جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا کہا، درآنحالیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں ہے، اس پر جنت حرام ہے"۔ اسی مضمون کی دوسری روایات بھی احادیث میں ملتی ہیں جن میں اِس فعل کو سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔

۹ یعنی اِس صورت میں بھی یہ درست نہ ہوگا کہ کسی شخص سے خواہ مخواہ اس کا نسب ملایا جائے۔

۱۰ مطلب یہ ہے کہ کسی کو پیار سے بیٹا کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح ماں، بیٹی، بہن، بھائی وغیرہ الفاظ بھی اگر کسی کے لیے محض اخلاقاً استعمال کر لیے جائیں تو کوئی گناہ نہیں

بلاشبہ نبی تو اہلِ ایمان کے لیے اُن کی اپنی ذات پر مقدم ہے[۱۲]، اور نبی کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں[۱۳]، مگر کتاب اللہ کی رُو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے

لیکن اس ارادے سے یہ بات کہنا کہ جسے بیٹا یا بیٹی وغیرہ کہا جائے اس کو واقعی وہی حیثیت دیدی جائے جو ان رشتوں کی ہے، اور اس کے لیے وہی حقوق ہوں جو ان رشتہ داروں کے ہیں، اور اس کے ساتھ ویسے ہی تعلقات ہوں جیسے ان رشتہ داروں کے ساتھ ہوتے ہیں، تو یہ یقیناً قابلِ اعتراض ہے اور اس پر گرفت ہوگی۔

[۱۱] اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ پہلے اس سلسلے میں جو غلطیاں کی گئی ہیں ان کو اللہ نے معاف کیا۔ ان پر اب کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نادانستہ افعال پر گرفت کرنے والا نہیں ہے۔ اگر بلا ارادہ کوئی ایسی بات کی جائے جس کی ظاہری صورت ایک ممنوع فعل کی سی ہو، مگر اس میں درحقیقت اس ممنوع فعل کی نیت نہ ہو، تو محض فعل کی ظاہری شکل پر اللہ تعالیٰ سزا نہ دے ڈالے گا۔

[۱۲] یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں سے اور مسلمانوں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تعلق ہے وہ تمام دوسرے انسانی تعلقات سے ایک بالاتر نوعیت رکھتا ہے۔ کوئی رشتہ اُس رشتے سے اور کوئی تعلق اُس تعلق سے جو نبی اور اہلِ ایمان کے درمیان ہے، ذرہ برابر بھی کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے ان کے ماں باپ سے بھی بڑھ کر شفیق و رحیم اور ان کی اپنی ذات سے بھی بڑھ کر خیر خواہ ہیں۔ ان کے ماں باپ اور ان کے بیوی بچے ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، ان کے ساتھ خود غرضی برت سکتے ہیں، ان کو گمراہ کر سکتے ہیں، ان سے غلطیوں کا ارتکاب کرا سکتے ہیں، ان کو جہنم میں دھکیل سکتے ہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے حق میں صرف وہی بات کرنے والے ہیں جن میں اُن کی حقیقی فلاح ہو۔ وہ خود اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار سکتے ہیں، حماقتیں کر کے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر سکتے ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے لیے وہی کچھ تجویز کریں گے جو فی الواقع ان کے حق میں نافع ہو۔ اور جب معاملہ یہ ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مسلمانوں پر یہ حق ہے کہ وہ آپ کو اپنے ماں باپ اور اولاد اور اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھیں، دنیا کی ہر چیز سے زیادہ آپ سے محبت رکھیں، اپنی رائے پر آپ کی رائے کو اور اپنے فیصلے پر آپ کے فیصلے کو مقدم رکھیں، اور آپ کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ارشاد فرمایا ہے جسے بخاری و مسلم وغیرہ نے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے کہ لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ و الناس اجمعین "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو اس کے باپ اور اولاد اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہوں"۔

۱۱؎ اسی خصوصیت کی بنا پر جو اوپر مذکور ہوئی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی اپنی منہ بولی مائیں تو کسی معنی میں بھی ان کی ماں نہیں ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اسی طرح ان کے لیے حرام ہیں جس طرح ان کی حقیقی مائیں حرام ہیں۔ یہ مخصوص معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دنیا میں اور کسی انسان کے ساتھ نہیں ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس معنی میں امہات مومنین ہیں کہ ان کی تعظیم و تکریم مسلمانوں پر واجب ہے اور ان کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ باقی دوسرے احکام میں وہ ماں کی طرح نہیں ہیں۔ مثلاً ان کے حقیقی رشتہ داروں کے سوا باقی سب مسلمان ان کے لیے غیر محرم تھے جن سے پردہ واجب تھا۔ ان کی صاحبزادیاں مسلمانوں کے لیے ماں جائی بہنیں نہ تھیں کہ ان سے بھی مسلمانوں کا نکاح ممنوع ہوتا۔ ان کے بھائی بہن مسلمانوں کے لیے خالہ اور ماموں کے حکم میں نہ تھے۔ ان سے کسی غیر رشتہ دار مسلمان کو وہ میراث نہیں پہنچتی تھی جو ماں سے پہنچتی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید کی رو سے یہ مرتبہ تمام ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے جن میں لامحالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں لیکن ایک گروہ نے جب حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کی اولاد کو مرکز دین بنا کر سارا نظام دین انہی کے گرد گھما دیا، اور اس بنا پر دوسرے بہت سے صحابہ کے ساتھ حضرت عائشہ کو بھی ہدف لعن و طعن بنایا، تو ان کی راہ میں قرآن مجید کی یہ آیت حائل ہو گئی جس کی رو سے ہر اس شخص کو انہیں اپنی ماں تسلیم کرنا پڑتا ہے جو ایمان کا مدعی ہو۔ آخر کار اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے یہ عجیب و غریب دعویٰ کیا گیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کی ازواج مطہرات میں سے جس کو چاہیں آپ کی زوجیت پر باقی

کے زیادہ حق دار ہیں، البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہو۔ یہ حکم کتابِ الٰہی میں لکھا ہوا ہے۔

رکھیں اور جسے چاہیں آپ کی طرف سے طلاق دے دیں، چنانچہ جنگ جمل کے بعد انہوں نے حضرت عائشہؓ کو طلاق دے دی تھی، لہٰذا اب وہ ام المومنین نہیں ہیں۔ ابو منصور احمد بن ابی طالب طبرسی نے کتاب الاحتجاج میں یہ بات لکھی ہے اور سلیمان بن عبداللہ البحرانی نے اسے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا یا ابا الحسن ان ھٰذا الشرف باق ما دمنا علی طاعۃ اللہ تعالیٰ فایتھن عصت اللہ تعالیٰ بعدی بالخروج علیک فطلقھا من الازواج واسقطھا من شرف امھات المومنین (اے ابوالحسن، یہ شرف تو اسی وقت تک باقی ہے جب تک ہم لوگ اللہ کی اطاعت پر قائم رہیں۔ لہٰذا میری بیویوں میں سے جو بھی میرے بعد تیرے خلاف خروج کرکے اللہ کی نافرمانی کرے اسے تو طلاق دے دیجیو اور اس کو امہات المومنین کے شرف سے ساقط کر دیجیو) اصولِ روایت کے اعتبار سے تو یہ روایت سراسر بے اصل ہے ہی، لیکن اگر آدمی محض عقل ہی سے کام لے کر اس کے مضمون پر غور کرے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ انتہائی لغو، اور رسولِ پاکؐ کے حق میں سخت توہین آمیز افترا ہے۔ رسول کا مقام تو بہت بالاتر و برتر ہے، ایک معمولی شریف آدمی سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی وفات کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دینے کی فکر کرے گا اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنے داماد کو یہ اختیار دے جائے گا کہ اگر کبھی تیرا اس کے ساتھ جھگڑا ہو تو میری طرف سے تو اس کو طلاق دے دیجیو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اہل البیت کی محبت کے مدعی ہیں ان کے دلوں میں صاحب البیت کی عزت و ناموس کا پاس کتنا کچھ ہے، اور اس سے بھی گزر کر خود اللہ تعالیٰ کے ارشادات کا وہ کتنا احترام کرتے ہیں۔

۱۲ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ہے، اُن کے ساتھ تو مسلمانوں کے تعلق کی نوعیت سب سے الگ ہے۔ لیکن عام مسلمانوں کے درمیان آپس کے تعلقات اس اصول پر قائم ہوں گے کہ رشتہ داروں کے حقوق ایک دوسرے پر عام لوگوں کی بہ نسبت مقدم ہیں،

اور (اے نبی) یاد رکھو اُس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے، تم سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔ سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔[۱۵]

کوئی خیرات اس صورت میں صحیح نہیں ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ، بال بچوں، اور بھائی بہنوں کی ضروریات تو پوری نہ کرے اور باہر خیرات کرتا پھرے۔ زکوٰۃ سے بھی آدمی کو پہلے اپنے غریب رشتہ داروں کی مدد کرنی ہوگی، پھر وہ دوسرے مستحقین کو دیگا۔ میراث لازماً اُن لوگوں کو پہنچے گی جو رشتے میں آدمی سے قریب تر ہوں۔ دوسرے لوگوں کو اگر وہ چاہے تو ہبہ یا وقف یا وصیت کے ذریعہ سے اپنا مال دے سکتا ہے، مگر اس طرح نہیں کہ وارث محروم رہ جائیں اور سب کچھ دوسروں کو دے ڈالا جائے۔ اِس حکم الٰہی سے وہ طریقہ بھی موقوف ہو گیا جو ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے سے شروع ہوا تھا جس کی رو سے محض دینی برادری کے تعلق کی بنا پر مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ وراثت تو رشتہ داری کی بنا پر ہی تقسیم ہوگی، البتہ ایک شخص ہدیے، تحفے، یا وصیت کے ذریعہ سے اپنے کسی دینی بھائی کی کوئی مدد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

[۱۵] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات یاد دلاتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح آپ سے بھی اللہ تعالیٰ ایک پختہ عہد لے چکا ہے جس کی آپ کو سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیے۔ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے؟ اوپر سے جو سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے اُس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ عہد ہے کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی خود اطاعت کرے گا اور دوسروں سے کرائے گا، اللہ کی باتوں کو بے کم و کاست پہنچائے گا اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی سعی و جہد میں کوئی دریغ نہ کرے گا۔ قرآن مجید میں اس عہد کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖ

اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا تمہارے لیے وہ دین جس کی ہدایت کی تھی اس نے نوح کو، اور جس کی وحی (آگے)

اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى ۔ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۔ (الشوریٰ ۔ آیت ۱۳)

(اے محمدؐ) تمہاری طرف ، اور جس کی ہدایت کی گئی ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو ۔ اس تاکید کے ساتھ کہ تم لوگ قائم کرو اس دین کو اور اس میں تفرقہ نہ کرو

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران ۔ ۱۸۷)

اور یاد کرو اس بات کو کہ اللہ نے عہد لیا تھا اُن لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لوگ اس کی تعلیم کو بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۔ (البقرہ ۔ ۸۳)

اور یاد کرو کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو گے ۔

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ ۔ ۔ ۔ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (الاعراف ۔ آیات ۱۶۹ ۔ ۱۷۱)

کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا گیا تھا ؟ ۔ ۔ ۔ مضبوطی کے ساتھ تھامو اُس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے اور یاد رکھو اس ہدایت کو جو اس میں ہے ، توقع ہے کہ تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو گے

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۔ (المائدہ ۔ ۷)

اور اے مسلمانو ، یاد رکھو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے اور اُس عہد کو جو اس نے تم سے لیا ہے جبکہ تم نے کہا " ہم نے سنا اور اطاعت کی "

اس عہد کو اس سیاق و سباق میں اللہ تعالیٰ جس وجہ سے یاد دلا رہا ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شماتتِ اعداء کے اندیشے سے منہ بولے رشتوں کے معاملہ میں حیا ہیت کی رسم کو توڑتے ہوئے جھجک رہے تھے ۔ آپ کو بار بار یہ شرم لاحق ہو رہی تھی کہ معاملہ ایک خاتون سے شادی کرنے کا ہے ۔ میں معاملہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ محض اصلاحِ معاشرہ کی خاطر یہ کام کروں ، مگر دشمن یہی کہیں گے کہ یہ کام دراصل نفس پرستی کی خاطر کیا گیا ہے اور مُصلح کا لبادہ اس شخص نے محض فریب دینے کے لیے اوڑھ رکھا ہے ۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ حضورؐ سے فرما رہا ہے کہ تم ہمارے مقرر کیے ہوئے پیغمبر ہو، تمام پیغمبروں کی طرح تم سے بھی ہمارا یہ پختہ معاہدہ ہے کہ جو کچھ بھی حکم ہم دینگے اس کو خود بجا لاؤ گے اور دوسروں کو اس کی پیروی کا حکم دو گے، لہٰذا تم کسی کے طعن و تشنیع کی پروا نہ کرو، کسی سے شرم اور خوف نہ کرو، اور جو خدمت ہم تم سے لینا چاہتے ہیں اسے بلا تامل انجام دو۔

ایک گروہ اِس میثاق سے وہ میثاق مراد لیتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاء اور ان کی امتوں سے اس بات کے لیے لیا گیا تھا کہ وہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے۔ اِس تاویل کی بنیاد پر اس گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور حضورؐ سے بھی یہ میثاق لیا گیا ہے کہ آپ کے بعد جو نبی آئے آپ کی امت اس پر ایمان لائے گی۔ لیکن آیت کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ یہ تاویل بالکل غلط ہے۔ جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت آئی ہے اُس میں یہ کہنے کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے کہ آپ کے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور آپ کی امت کو ان پر ایمان لانا چاہیے۔ یہ مفہوم اس کا لیا جائے تو یہ آیت یہاں بالکل بے جوڑ اور بے محل ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں کوئی صراحت ایسی نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہاں میثاق سے کونسا میثاق مراد ہے۔ لامحالہ اس کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے ہم کو قرآن مجید کے دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرنا ہوگا جہاں انبیاء سے لیے ہوئے مواثیق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اگر سارے قرآن میں صرف ایک ہی میثاق کا ذکر ہوتا اور وہ بعد کے آنے والے انبیاء پر ایمان لانے کے بارے میں ہوتا تو یہ خیال کرنا درست ہوتا کہ یہاں بھی میثاق سے مراد وہی میثاق ہے۔ لیکن قرآن پاک کو جس شخص نے بھی کبھی آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کتاب میں بہت سے میثاقوں کا ذکر ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں سے لیے گئے ہیں۔ لہٰذا اُن مختلف مواثیق میں سے وہ میثاق یہاں مراد لینا صحیح ہوگا جو اِس سیاق و سباق سے مناسبت رکھتا ہو، نہ کہ وہ میثاق جس کے ذکر کا یہاں کوئی موقع نہ ہو۔ اسی طرح کی غلط تاویلوں سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ بعض لوگ قرآن سے ہدایت لینے نہیں بیٹھتے بلکہ اسے ہدایت دینے بیٹھ جاتے ہیں۔

تاکہ سچے لوگوں سے (ان کا رب) ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے[۱۶]، اور کافروں کے لیے تو اس نے دردناک عذاب مہیا کر ہی رکھا ہے[۱۷] ع

اے[۱۸] لوگو جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے اُس احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے تم پر کیا ہے جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں[۱۹]۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔ جب وہ اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے[۲۰]۔ جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آگئے، اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اُس

[۱۶] یعنی اللہ تعالیٰ محض عہد لے کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس عہد کے بارے میں وہ سوال کرنے والا ہے کہ اس کی کہاں تک پابندی کی گئی۔ پھر جن لوگوں نے سچائی کے ساتھ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو وفا کیا ہوگا وہی صادق العہد قرار پائیں گے۔

[۱۷] اِس رکوع کے مضمون کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو آیات ۲۶-۲۷ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔

[۱۸] یہاں سے رکوع ۳ کے آخر تک کی آیات اُس وقت نازل ہوئی تھیں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی قریظہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ ان دونوں رکوعوں میں غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قریظہ کے واقعات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان کو پڑھتے وقت ان دونوں غزوات کی وہ تفصیلات نگاہ میں رہنی چاہییں جو ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں۔

[۱۹] یہ آندھی اُسی وقت نہیں آگئی تھی جبکہ دشمنوں کے لشکر مدینے پر چڑھ کر آئے تھے بلکہ اُس وقت آئی تھی جب محاصرے کو تقریباً ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ نظر نہ آنے والی فوجوں سے مراد وہ مخفی طاقتیں ہیں جو انسانی معاملات میں اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کام کرتی رہتی ہیں اور انسانوں کو ان کی خبر تک نہیں ہوتی۔ انسان واقعات و حوادث کو صرف ان کے ظاہری اسباب پر محمول کرتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر غیر محسوس طور پر جو قوتیں کام کرتی ہیں وہ اس کے حساب میں

وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔[۲۱]

یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کیے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔[۲۲] جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ "اے یثرب کے لوگو، تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پلٹ چلو۔[۲۳]" جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبی سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ "ہمارے گھر خطرے میں ہیں۔[۲۴]" حالانکہ وہ

نہیں آتیں، حالانکہ اکثر حالات میں انہی مخفی طاقتوں کی کارفرمائی فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔ یہ طاقتیں چونکہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی ماتحتی میں کام کرتی ہیں اس لیے "فوجوں" سے مراد فرشتے بھی لیے جا سکتے ہیں اگرچہ یہاں فرشتوں کی فوجیں بھیجنے کی صراحت نہیں ہے۔

۲۰؎ اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہر طرف سے چڑھ آئے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نجد اور خیبر سے چڑھ کر آنے والے اوپر سے آئے، اور مکہ معظمہ کی طرف سے آنے والے نیچے سے آئے۔

۲۱؎ ایمان لانے والوں سے مراد یہاں وہ سب لوگ ہیں جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مان کر اپنے آپ کو حضورؐ کے پیروؤں میں شامل کیا تھا، جن میں سچے اہل ایمان بھی شامل تھے اور منافقین بھی۔ اس پیراگراف میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے گروہ کا مجموعی طور پر ذکر فرما رہا ہے۔ اس کے بعد کے دو پیراگرافوں میں منافقین کی روش پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پھر آخر کے دو پیراگراف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین صادقین کے بارے میں ہیں۔

۲۲؎ یعنی اس امر کے وعدے کہ اہل ایمان کو اللہ کی تائید و نصرت حاصل ہوگی اور آخر کار غلبہ انہی کو بخشا جائے گا۔

۲۳؎ اس فقرے کے دو مطلب ہیں۔ ظاہری مطلب یہ ہے کہ خندق کے سامنے کفار کے مقابلے پر ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے شہر کی طرف پلٹ چلو، اور باطنی مطلب یہ ہے کہ

خطرے میں نہ تھے[۲۵]، دراصل وہ (محاذِ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آتے ہوتے اور اُس وقت انہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی[۲۶] تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں شریکِ فتنہ ہونے میں کوئی تأمل ہوتا — ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ یہ پیٹھ نہ پھیریں گے، اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی

اسلام پر ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، اب اپنے آبائی مذہب کی طرف پلٹ جانا چاہیے تاکہ سارے عرب کی دشمنی مول لیکر ہم نے جس خطرے میں اپنے آپ کو ڈال دیا ہے اُس سے بچ جائیں۔ منافقین اپنی زبان سے اس طرح کی باتیں اس لیے کہتے تھے کہ جو ان کے دام میں آسکتا ہو اس کو تو اپنا باطنی مطلب سمجھا دیں، لیکن جو ان کی بات سُن کر چوکنا ہو اور اس پر گرفت کرے اس کے سامنے اپنے ظاہر الفاظ کی آڑ لے کر گرفت سے بچ جائیں۔

۲۴؎ یعنی جب بنو قریظہ بھی حملہ آوروں کے ساتھ مل گئے تو ان منافقین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر سے نکل بھاگنے کے لیے ایک اچھا بہانہ ہاتھ آگیا اور انہوں نے یہ کہہ کر رخصت طلب کرنی شروع کی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں، لہٰذا ہمیں جا کر اپنے بال بچوں کی حفاظت کرنے کا موقع دیا جائے۔ حالانکہ اُس وقت سارے اہلِ مدینہ کی حفاظت کے ذمہ دار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ بنی قریظہ کی بدعہدی سے جو خطرہ بھی پیدا ہوا تھا اس سے شہر اور اس کے باشندوں کو بچانے کی تدبیر کرنا حضورؐ کا کام تھا نہ کہ فوج کے ایک ایک فرد کا۔

۲۵؎ یعنی اس خطرے سے بچاؤ کا انتظام تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کر چکے تھے۔ یہ انتظام بھی دفاع کی اُس مجموعی اسکیم ہی کا ایک حصہ تھا جس پر سالارِ لشکر کی حیثیت سے حضور عمل فرما رہے تھے۔ اس لیے کوئی فوری خطرہ اُس وقت درپیش نہ تھا جس کی بنا پر ان کا یہ عذر کسی درجے میں بھی معقول ہوتا۔

۲۶؎ یعنی شہر میں داخل ہو کر فاتح کفار ان منافقین کو دعوت دیتے کہ آؤ ہمارے ساتھ

باز پُرس تو ہونی ہی تھی ۲۷؎

اَے نبیؐ، ان سے کہو، اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمہیں مل سکے گا ۲۸؎۔ اِن سے کہو، کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہو اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے؟ اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر مہربانی کرنا چاہے؟ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے۔

اللہ تم میں سے ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو (جنگ کے کام میں) رکاوٹیں ڈالنے والے ہیں، جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ "آؤ ہماری طرف ۲۹؎"۔ جو لڑائی میں حصہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو، جو تمہارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں ۳۰؎۔ خطرے کا وقت

مل کر مسلمانوں کو ختم کر دو۔

۲۷؎ یعنی جنگ اُحد کے موقع پر جو کمزوری انہوں نے دکھائی تھی اس کے بعد شرمندگی و ندامت کا اظہار کر کے ان لوگوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اب اگر آزمائش کا کوئی موقع پیش آیا تو ہم اپنے اس قصور کی تلافی کر دیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو محض باتوں سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ جو شخص بھی اُس سے کوئی عہد باندھتا ہے اُس کے سامنے کوئی نہ کوئی آزمائش کا موقع وہ ضرور لے آتا ہے تاکہ اس کا جھوٹ سچ کھل جائے۔ اس لیے وہ جنگِ اُحد کے دو ہی سال بعد اُس سے بھی زیادہ بڑا خطرہ سامنے لے آیا اور اُس نے جانچ کر دیکھ لیا کہ اِن لوگوں نے کیسا کچھ سچا عہد اُس سے کیا تھا۔

۲۸؎ یعنی اِس فرار سے کچھ تمہاری عمر بڑھ نہیں جائے گی۔ اس کا نتیجہ بہر حال یہ نہیں ہوگا کہ تم قیامت تک جیو اور روئے زمین کی دولت پالو۔ بھاگ کر بھی جیو گے تو زیادہ سے زیادہ چند سال ہی جیو گے اور اُتنا ہی کچھ دنیا کی زندگی کا لطف اٹھا سکو گے جتنا تمہارے لیے مقدر ہے۔

۲۹؎ یعنی چھوڑو اس پیغمبرؐ کا ساتھ۔ کہاں دین و ایمان اور حق و صداقت کے چکر میں پڑے ہو۔ اپنے

آجائے تو اس طرح دید سے پھرا پھرا کر تمہاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو، مگر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو یہی لوگ فائدوں کے حریص بن کر قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں لیے تمہارے استقبال کو آجاتے ہیں[۳۱]۔ یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے اسی لیے اللہ نے ان کے سارے اعمال ضائع کر دیئے[۳۲]، اور ایسا کرنا اللہ کے لیے

آپ کو خطرات اور مصائب میں مبتلا کرنے کے بجائے وہی عافیت کوشی کی پالیسی اختیار کرو جو ہم نے اختیار کر رکھی ہے۔

۳۰؎ یعنی اپنی محنتیں، اپنے اوقات، اپنی فکر، اپنے مال، غرض کوئی چیز بھی وہ اُس راہ میں صرف کرنے کے لیے بخوشی تیار نہیں ہیں جس میں مومنین صادقین اپنا سب کچھ جھونکے دے رہے ہیں۔ جان کھپانا اور خطرے انگیز کرنا تو بڑی چیز ہے، وہ کسی کام میں بھی کھلے دل سے اہلِ ایمان کا ساتھ نہیں دینا چاہتے۔

۳۱؎ لغت کے اعتبار سے اس آیت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ لڑائی سے جب تم کامیاب پلٹتے ہو تو وہ بڑے تپاک سے تمہارا استقبال کرتے ہیں اور چرب زبانی سے کام لے کر یہ دھونس جمانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بھی بڑے مومن ہیں اور ہم نے بھی اس کام کو فروغ دینے میں حصہ لیا ہے، لہٰذا ہم بھی مالِ غنیمت کے حق دار ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر فتح نصیب ہوتی ہے تو مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر یہ لوگ زبان کی بڑی تیزی دکھاتے ہیں اور بڑھ بڑھ کر مطالبے کرتے ہیں کہ لاؤ ہمارا حصہ، ہم نے بھی خدمات انجام دی ہیں، سب کچھ تم ہی لوگ نہ لوٹ لے جاؤ۔

۳۲؎ یعنی اسلام قبول کرنے کے بعد جو نمازیں انہوں نے پڑھیں، جو روزے رکھے، جو زکوٰتیں دیں، اور بظاہر جو نیک کام بھی کیے ان سب کو اللہ تعالیٰ کالعدم قرار دے دیگا۔ اور ان کا کوئی اجر انہیں نہ دیگا۔ کیونکہ اللہ کے ہاں فیصلہ اعمال کی ظاہری شکل پر نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس ظاہر کی تہ میں ایمان اور خلوص ہے یا نہیں۔ جب یہ چیز سرے سے ان کے اندر موجود ہی نہیں ہے تو یہ دکھاوے کے اعمال سراسر بے معنی ہیں۔ اس مقام پر یہ امر گہری توجہ کا طالب ہے کہ جو لوگ

بہت آسان ہے۔[۳۳] یہ سمجھ رہے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں ہیں۔ اور اگر وہ پھر حملہ آور ہو جائیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ اُس موقع پر یہ کہیں صحرا میں بدوؤں کے درمیان جا بیٹھیں اور وہیں سے تمہارے حالات پوچھتے رہیں۔ تاہم اگر یہ تمہارے درمیان رہے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیں گے۔ ع ۲

اللہ اور رسول کا اقرار کرتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے۔ روزے رکھتے تھے، زکوٰۃ بھی دیتے تھے، اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے دوسرے نیک کاموں میں بھی شریک ہوتے تھے، ان کے بارے میں صاف صاف فیصلہ دے دیا گیا ہے کہ یہ سرے سے ایمان لائے ہی نہیں۔ اور یہ فیصلہ صرف اِس بنیاد پر دیا گیا ہے کہ کفر اور اسلام کی کشمکش میں جب کڑی آزمائش کا وقت آیا تو انہوں نے دوغلے پن کا ثبوت دیا، دین کے مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح دی، اور اسلام کی حفاظت کے لیے جان، مال اور محنت صرف کرنے میں دریغ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فیصلے کا اصل مدار یہ ظاہری اعمال نہیں ہیں، بلکہ یہ سوال ہے کہ آدمی کی وفاداریاں کس طرف ہیں۔ جہاں خدا اور اس کے دین سے وفاداری نہیں ہے وہاں اقرارِ ایمان اور عبادات اور دوسری نیکیوں کی کوئی قیمت نہیں۔

۳۳؎ یعنی ان کے اعمال کوئی وزن اور قیمت نہیں رکھتے کہ ان کو ضائع کر دینا اللہ کو گراں گزرے اور یہ لوگ کوئی خدشہ نہیں رکھتے کہ ان کے اعمال کو ضائع کرنا اُس کے لیے دشوار ہو۔